اسلام

از ڈاکٹر فضل الرحمٰن ★ ترجمہ: مظہر الدین صدیقی

"Islam" کے نام سے ڈاکٹر فضل الرحمٰن ڈائرکٹر ادارۂ تحقیقات اسلامی کی ایک کتاب ابھی حال میں لندن کے ایک ناشر نے شائع کی ہے، اس کتاب کا تعارف چند ماہ قبل "فکر و نظر" میں کرایا جا چکا ہے، یہاں اس کتاب کی "انٹروڈکشن" کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے دوسرے ابواب کا ترجمہ بھی وقتاً فوقتاً نذرِ قارئین کیا جائے گا۔ (مدیر)

تمہید

پروفیسر ایچ اے آر گب نے اپنی وقیع کتاب محمڈنزم (MOHAMMADANISM) کی تازہ ترین اشاعت (یعنی ۱۹۶۱ء کے ایڈیشن) میں دنیا بھر کے مسلمانوں کی تعداد تیس کروڑ بتائی ہے (جو اب چالیس کروڑ کے لگ بھگ ہوگی)۔ یہ تعداد دنیا کی کل آبادی کا ساتواں حصہ ہے۔ اس کے برعکس عالمی مسلم کانگریس نے اپنے پانچویں اجلاس منعقدہ بغداد ۱۹۶۲ء میں جو اعداد و شمار جاری کیے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی کل آبادی ساٹھ کروڑ سے زیادہ یعنی تقریباً پینسٹھ کروڑ ہے۔ لیکن یہ سب اعداد و شمار قیاسی ہیں، اور ان پر پوری طرح اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ چین میں مسلمانوں کی صحیح تعداد اب تک پردہ خفا میں ہے، اور عالم اسلام کے دور دراز علاقوں کی آبادی کے متعلق صحیح معلومات ابھی تک نامکمل ہیں، اس تمہید کے آخر میں ہم چند اعداد و شمار پیش کریں گے جن سے معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی آبادی دنیا کے مختلف حصوں میں کس طرح منقسم ہے۔ ان اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا بھر میں مسلمانوں کی کل آبادی پچاس کروڑ سے کم نہیں ہے۔

لیکن یہ سوال کہ دنیا میں مسلمانوں کی کل آبادی کتنی ہے غالباً اس مسئلہ کے بالمقابل ثانوی اہمیت رکھتا ہے کہ گزشتہ چودہ سو سال میں ملت اسلامیہ کا نشو و نما کس طور پر عمل میں آیا اور اس سے بھی زیادہ

اہمیت اس سوال کی ہے کہ اس نشو و نما کی نوعیت کیا رہی، کیوں کہ اس نوعیت سے ملّتِ اسلامیہ کی داخلی ہیئت پر روشنی پڑتی ہے۔ آئندہ ابواب میں اسلام کی مذہبی تاریخ کا تفصیلی جائزہ لینے سے قبل ہم یہاں اس مسئلہ سے بحث کریں گے۔ پیغمبر اسلامؐ کی وفات سے کچھ زمانہ قبل اسلام کی سب سے اہم خصوصیت نمایاں طور پر نشو و نما پا چکی تھی یعنی امت مسلمہ کا قیام جس کے عقیدہ و ایمان کا عملی ظہور ان مختلف ادارہ جات میں ہوتا تھا جن کی پشت پناہ ایک منظم حکومت تھی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس ساری تعمیر میں امت کا وجود زیادہ بنیادی اہمیت رکھتا تھا اور حکومت کی تنظیم یا دیگر ادارہ جات کی حیثیت اتنی بنیادی نہ تھی۔ امت کی حقیقت کیا ہے، وہ مشیت الٰہی کی حامل اوّل یعنی اوامر الٰہی یا شریعت (دیکھیے باب ششم) کی اطاعت گزار ہے، اور اس نے شعوری طور پر اس حیثیت کو قبول کیا ہے۔ وہ حکومتی تنظیم اور دوسرے اجتماعی اداروں کے ذریعہ اس فریضہ سے سبکدوش ہوتی ہے۔ شریعت امتِ مسلمہ کا دستورِ حیات ہے۔

یہ شریعت کا بنیادی دستور ہی تھا جس نے بیرونِ عرب اسلامی فتوحات کو ان کی مخصوص ہیئت عطا کی اور انہیں زمانہ ماقبل اسلام کے عربوں کی آئین ناشناس قبائلی توسیع سے ایک طرف اور دوسری طرف زمانہ مابعد میں وسط ایشیا کی منگول فتوحات سے متمیز کیا۔ امت کے یہ داخلی قوت اور بیرونی توسیع کے دور میں اس نے اپنے اصولوں پر استقامت کا جو مظاہرہ کیا، نیز ایک اعلیٰ تر اخلاقی نظام میں اس کا پختہ عقیدہ جس نے اس کی توسیعی جد و جہد کو ایک یکساں اخلاقی سطح پر قائم رکھا، یہ سب جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال اور تعلیمات کے فیوض تھے۔ یہ تمام امور عرب سے باہر اسلام کی توسیع میں معاون ثابت ہوئے اور جیسا کہ معلوم ہے یہ توسیع اتنی برق رفتار فتوحات کے ذریعہ عمل میں آئی کہ ایک صدی کے اندر اندر مسلمان دنیا کے ایک وسیع علاقہ پر چھا گئے جو مغرب میں اندلس سے لے کر وسط ایشیا سے گزرتا ہوا مشرق میں دریائے سندھ تک وسیع تھا۔ بعد میں اسی اخلاقی قوت کے نتیجہ میں مسلمانوں کی حکومتیں ان علاقوں میں مستحکم ہو گئیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بازنطینی اور ایرانی سلطنتوں کی داخلی کمزوریاں، ان کی مسلسل باہمی جنگ و پیکار اور ان کا روحانی اور اخلاقی جمود جو ان کو اندر سے گھن کی طرح کھا گیا تھا، یہ سب باتیں مسلمانوں کے خیرہ کن فاتحانہ اقدامات کی تیز رفتاری میں معاون ثابت ہوئیں۔ لیکن اسلامی فتوحات کی اس حیرت انگیز رفتار کی توجیہہ صرف انہیں چند عوامل سے نہیں کی جا سکتی بلکہ اسلامی تحریک کے جاندار افکار و تصورات کی نوعیت کو بھی قرار واقعی

اہمیت دینی ضروری ہے۔ اس توسیع کی صحیح نوعیت کو ایک بڑی زبردست بحث و نزاع کا موضوع بنالیا گیا ہے اور جو مسائل اس سے متعلق ہیں انھیں اسلام کے مغربی نقادوں نیز ایک حد تک خود زمانہ حال کے مسلمان اہلِ قلم کے معذرت خواہانہ لب ولہجہ نے بہت کچھ اُلجھا دیا ہے۔ یہ دعویٰ کرنا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا حقائق سے روگردانی کرنے کے مترادف ہے مگر یہ بھی ایک غلط بیانی ہوگی اگر ہم یہ کہیں اسلام کی اشاعت بالکل اسی طرح عمل میں آئی جیسے بدھ مت یا عیسائیت کی، باوجود اس امر کے کہ عیسائیت نے وقتاً فوقتاً اپنی اشاعت کے سلسلہ میں سیاسی طاقت کا استعمال کیا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی مذہبی اور سیاسی تعمیر ہی میں وہ صور و عناصر مضمر تھے جو اس کی فوجی فتوحات کا باعث ہوئے۔ اگرچہ مسلمانوں نے اپنے مذہب کو تلوار کے زور سے نہیں پھیلایا لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ اسلام نے سیاسی طاقت کے حصول پر زور دیا کیوں کہ اس نے خود کو مشیّت الٰہی کا مہبط قرار دیا تھا اور اس عالم میں مشیّتِ الٰہی کی تکمیل کے لئے سیاسی نظام کو ذریعہ کے طور پر استعمال کرنا ضروری تھا۔ اس نقطۂ نظر سے اسلام اشتمالیت کے نظام سے مشابہ ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ اگرچہ اسلام لوگوں پر جبر و اکراہ کے ذریعہ اپنا عقیدہ نہیں ٹھونستا اس کے باوجود وہ سیاسی طاقت کے حصول پر اصرار کرتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار کرنا اسلام کی تاریخ کو جھٹلانے اور اسلام کے ساتھ ناانصافی کرنے کے مترادف ہوگا۔ ہمارے نزدیک اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کے مفتوحہ علاقوں میں جس سرعت کے ساتھ اسلامیت کے آثار و علائم پیدا ہوئے ان میں اس حقیقت کو بڑا دخل تھا مگر ساتھ ساتھ اسلام کے باطن میں مساوات اور انسانیت پروری کی جو خصوصیات موجود تھیں، انہوں نے بھی اسلامیت کی ترقی میں بڑا حصہ لیا۔

عرب سے باہر اسلامی سلطنت کی توسیع کے ساتھ مسلمانوں کو نظم و نسق اور قانون کے ایک نظام کی تفصیلات معین کرنی پڑیں۔ اس کام میں انہوں نے بازنطینی اور ایرانی ادارہ جات اور دیگر مقامی عناصر کو اسلامی نظام کے اندر سمو لیا۔ یہی نظام تھا (جس کے ارتقاء پر اس کتاب کے آئندہ ابواب میں تفصیلی بحث کی جائے گی) جس نے اسلامی تہذیب کو اس کی مخصوص ہیئت عطا کی اور جس کے ذریعہ اسلام کے بنیادی اخلاقی میلانات کا اظہار عمل میں لاتے ہوئے مسلمانوں کے نظام سلطنت کے لئے نہ صرف ایک حقیقی دستور وضع کیا گیا بلکہ مسلم ریاست و حکومت کے حدود عمل کا تعین کیا گیا۔ اس طرح اسلامی فتوحات کی ایک صدی کے اندر اندر مسلمانوں کو یہ موقعہ ملا کہ وہ اپنی مخصوص حیاتِ عقلی کو نشو و نما دیں۔ جس کے نتیجہ میں انہوں نے حدیث، فقہ اور تاریخ کے علوم کی بنیاد ڈالی جو خالصتہً عربی علوم تھے۔ یہ

سریع الرفتار عقلی ترقی جو عربی قرآن کے نظام تصورات اور سرزمین شام کی یونانی روایات کے تعامل سے پیدا ہوئی، انسان کی فکری تاریخ کا ایک حیرت انگیز باب ہے۔

مسلمانوں کی اس عقلی ترقی میں جن عوامل نے سہولت پیدا کی وہ یہ تھے کہ اولاً اسلامی سلطنت کا مرکز مدینہ سے دمشق میں منتقل ہو گیا۔ دوسرے خلفائے بنو امیہ نے اپنے دربار میں بعض عیسائی عربوں کو جو یونانی ثقافت کے علمبردار تھے اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ مثلاً یحییٰ دمشقی (JOHN OF DAMASCUS)۔ لیکن اسی کے ساتھ دارالسلطنت کی منتقلی کے باعث ریاست اور مذہب کے تعلق کی نوعیت میں قدرے تبدیلی عمل میں آئی۔ اگرچہ یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ بنو امیہ کی سلطنت دریاست لادینی ہو گئی، اور یہ کہ مذہب و ریاست میں مکمل علیحدگی واقع ہو گئی پھر بھی یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی نشو و نما کے ساتھ ریاست کا وہ تعلق نہیں رہا جو اس سے پہلے کے دور میں تھا۔ خلفائے راشدین ایک مذہبی اور اخلاقی عظمت کے حامل تھے اور ان کے سیاسی فیصلے ہمیشہ کسی مذہبی مقصد کے تابع ہوا کرتے تھے، بنو امیہ زیادہ تر دنیوی حکمرانوں کی حیثیت رکھتے تھے جو سیاسی اقتدار کا استعمال تو ضرور کرتے تھے لیکن بڑی حد تک مذہبی وقار سے محروم تھے اگرچہ ان کی سلطنت کی ہیئت بنیادی طور پر اسلامی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خصوصی دینی علوم ریاست کے دائرہ سے نہ صرف خارج رہے بلکہ ایک حد تک ان میں اور ریاست کے درمیان کوئی توافق بھی قائم نہ ہو سکا اور مدینہ جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت کا مامن و مسکن تھا مذہبی نشو و ارتقا کا مرکز بھی رہا۔ (سنّت پر تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے باب سوم)

اسلام اور بیرونی ثقافتی میلانات بالخصوص یونانیت اور یونان زدہ عیسائیت کے تعامل کا ایک اہم نتیجہ یہ ہوا کہ بعض کلامی مسائل نیز کلامی اخلاقیات کی نسبت مسلمانوں میں شدید اختلافات پھوٹ پڑے۔ بہت سی ملحدانہ تحریکیں پیدا ہوئیں اور اسلام کے ابتدائی دور میں ہی بعض نئے مذہبی فرقے معرض وجود میں آ گئے۔ ان حالات نے ایک طرف، اور دوسری طرف غیر عرب مسلمانوں اور بالخصوص ایرانیوں کو بنو امیہ کی حکومت سے جو عناد پیدا ہو گیا تھا اس نے دوسری طرف کچھ ایسے اسباب جمع کر دیئے جن کے نتیجہ میں بالآخر ۷۵۰ء میں اموی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور بنو امیہ کی جگہ ایرانیوں کی معاونت سے بنو عباس برسر اقتدار آ گئے۔ بنو امیہ کے دور میں مسلمانوں کے مذہبی علوم کا آغاز ہو چکا تھا نیز بعض ملحدانہ تحریکات بھی پیدا ہوئی تھیں لیکن ان علوم اسلامی کا مکمل نشو و ارتقا جو علماء و فقہاء کے دائرہ سے باہر تھے اس

حکومت کے خاتمہ کے بعد عمل میں آیا۔

عباسی خلافت کے تحت دو ایسے مظاہر رونما ہوئے جو باہم متوافق نہ تھے اور ایک جانی بوجھی حکمت عملی کا نتیجہ تھے۔ ایک طرف تو عباسیوں نے علماء کے مطالبات کی پذیرائی کی جو بنو امیہ کے زمانہ اقتدار میں غیر مطمئن تھے اور اپنی ریاستی تنظیم کے ذریعہ ان کے مذہبی افکار و آراء کو عملی جامہ پہنایا اور اس طرح اس خلیج کو پاٹ دیا، جس نے اموی ریاست اور مذہب میں بڑی حد تک علیحدگی پیدا کر دی تھی، اور دوسری طرف انہوں نے یونانی فلسفہ، طب اور سائنس کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنے والے مترجمین کی سرکاری سرپرستی کر کے اسلام کی علمی بیداری کی تحریک کو فروغ دیا۔ چنانچہ اس مقصد سے مامون نے ایک بیت الحکمت کی بنا ڈالی۔ ان سرگرمیوں کے نتیجہ میں جو خالص عقلیت پیدا ہوئی اس کا ردّ عمل اسلام پہ ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ معتزلہ کی مشہور مذہبی تحریک اسی ردّ عمل کی پیداوار تھی۔

عباسیوں کے تحت جن کے اعلیٰ سرکاری عہدہ داروں کا تعلق ایران کے تعلیم یافتہ طبقہ سے تھا۔ ایرانیوں کا قومی شعور از سرِ نو بیدار ہو گیا۔ عربوں اور ایرانیوں کے درمیان ایک بڑا طویل اور تلخ علمی مجادلہ شروع ہوا جس میں ہر فریق اپنے روحانی، علمی اور ثقافتی تفوّق کا دعویدار تھا۔ ایرانی تہذیب و ثقافت کے طرفدار شعوبیہ (یعنی قوم پرست) کہلائے۔ ان کی سرگرمیوں کی حمایت و سرپرستی عباسی حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار کیا کرتے تھے۔ چوتھی/دسویں صدی اور پانچویں/گیارہویں صدی کے دوران فارسی زبان نے ادبی اظہارِ خیال کے وسیلہ کی حیثیت سے پھر اپنا سابقہ مقام حاصل کر لیا اور ایران کی قومی امنگوں کی تسکین کا سروسامان مہیا کیا اگرچہ مذہب اور عقلیات کے شعبہ میں عربی زبان کا استعمال جاری رہا۔

بیرونی ثقافتوں نے عربوں کی ذہنی حرکت میں جو حصہ لیا تھا اس کے نتائج دوسری تا چوتھی/آٹھویں تا دسویں صدی میں ظاہر ہوئے جب کہ مسلمانوں نے ایک شاندار مذہبی، علمی اور مادّی ثقافت پیدا کی۔ یہی زمانہ تھا جب کہ مسلمانوں نے ایک عظیم الشان اور پُر ثروت تجارت اور صنعت و حرفت بھی قائم کی اور تاریخ میں پہلی مرتبہ سائنسی مہارت کو انسان کی مادی ترقی کے لئے استعمال کیا اور اسے عملی اغراض کی خدمت میں لگایا۔ عربوں کے مخصوص علوم یعنی تاریخ اور ادب میں اتنی زبردست وسعت پیدا ہو گئی کہ عمومی تاریخ، جغرافیہ اور خالص ادبی تصانیف بھی ان کے زمرہ میں داخل ہو گئیں۔ معروضی

تاریخ نے جس میں تاریخ مذاہب بھی شامل ہے حیرت انگیز ترقی کی۔ مسلمان ایسے مشکل علمی کام بھی سرانجام دینے لگے جیسے کہ غیر اسلامی ادیان کا غیر متعصبانہ مطالعہ، یہاں تک کہ مشہور مورخ البیرونی کتاب الہند کے مقدمہ میں اس امر کی شکایت کرتا ہے کہ جب کہ ایک طرف مسلمانوں نے یہودیت اور عیسائیت جیسے مذاہب پر بے لاگ کتابیں لکھی ہیں، انہوں نے ہندو مت کا اب تک کوئی مطالعہ نہیں کیا اور اس وجہ سے وہ اس کام کو اپنے ذمہ لے رہا ہے۔ مسلمان جغرافیہ کے علم میں بھی گوئے سبقت لے گئے اور مسلمانوں نے اس شعبہ میں جو کام کیا اگرچہ اب دورِ جدید میں اس کی قدر و قیمت کا احساس کیا جانے لگا ہے لیکن انہوں نے جغرافیہ کے علم میں جس اپج اور مہم جوئی کا ثبوت دیا ابھی تک اس کا صحیح اندازہ نہیں کیا گیا ہے۔
تاریخ کا پہلا معاشرتی اور ثقافتی مطالعہ بھی ایک مشہور و معروف مسلمان مورّخ یعنی ابن خلدون نے کیا، اس نے تاریخِ عالم میں پہلی بار فطری تاریخی قوتوں کے عمل کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔

یہ ساری ترقیاں مذہبی عقلیت پر لازماً اثر انداز ہوئیں۔ چنانچہ دوسری/آٹھویں اور تیسری/نویں صدیوں میں معتزلی تحریک نے تیزی سے ترقی کی اور اپنے پورے شباب کو پہنچ گئی۔ معتزلی تحریک پر ہم اس کتاب کے کسی آئندہ باب میں بحث کریں گے۔ لیکن یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ تحریک یونانی عقلیت سے متاثر تھی اور اس وجہ سے اس نے اسلام کی مذہبی تاریخ میں پہلا بڑا مناقشہ پیدا کیا۔ راسخ العقیدہ مسلمانوں کے رہنماؤں کو جو قدیم روایات کے حامل تھے پہلے پہل معتزلی عقلیت کی تحریک کے مقابلہ میں پسپا ہونا پڑا کیوں کہ خلیفہ مامون نے معتزلی عقائد کو تقریباً ایک سرکاری مذہب بنا دیا لیکن کچھ زمانہ بعد سیاسی اثر و رسوخ حاصل کر کے نیز یونانی جدلیات کے طریقِ استدلال کو اپنا کر راسخ العقیدہ گروہ نے معتزلہ کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کر لی۔ رفتہ رفتہ راسخ العقیدہ علماء نے ساری تعلیم کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور تعلیم کا نصاب اس طرح مرتب کیا جس سے ان کے علمی اور مذہبی نصب العین کی تکمیل ہو سکے۔ اور پھر اس نصاب کو کامیاب طریقہ سے نافذ کیا۔

راسخ العقیدہ علماء نے جو طریقِ تعلیم جاری کیا وہ اس قدر مؤثر ثابت ہوا کہ مذہبی عقلیت کی تحریک اس کے سامنے ماند پڑ گئی اور اس تحریک کی عضوی وحدت کا شیرازہ بکھر گیا، اگرچہ چوتھی تا چھٹی صدی/دسویں تا بارہویں صدی کے ممتاز فلاسفہ اسلام کی فکر میں یہ تحریک از سر نو ظہور میں آئی، اور اس نے راسخ العقیدہ علماء کی علمی روایات کو بھی ایک حد تک متاثر کیا۔ اس نئے تصادم کے زیرِ اثر علماء نے

اپنے نظام تعلیم میں عقلیت کے لئے تھوڑی بہت گنجائش پیدا کی لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا ایک باقاعدہ اور منظم عقلی فلسفہ اور دیگر علوم کی نشو و نما کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں۔

اسلامی مدارس میں جو تعلیم دی جاتی تھی اس میں لچک بھی کم تھی اور اس کا دائرہ بھی بہت محدود تھا زمانہ مابعد میں مسلمانوں پر جو عقلی جمود طاری ہوا اس کی زیادہ تر ذمہ داری اسی طرزِ تعلیم پر تھی۔ علمائے ان علوم کے بارے میں جو دین سے خصوصی طور پر غیر متعلق تھے ایک ایسا رویہ اختیار کیا وہ بھی افسوسناک تھا، کیوں کہ اس سے تحقیق و جستجو کا مادہ ختم ہو گیا اور اس کے نتیجہ میں ایجابی علم کی نشو و نما کا سلسلہ بھی رک گیا۔ اس کے باوجود علماء نے اپنے طرز تعلیم کے باعث مسلمانوں میں ایک ذہنی یکسانیت پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی، اور مسلمانوں کے ملّی شیرازہ کو مجتمع رکھا جو بجائے خود ان کا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ اس سارے نظام کا محور اسلام کا فقہی نظام تھا جس کی تائید و حمایت کے لئے مسلمانوں کا علم کلام موجود تھا۔

اسلام کا فقہی نظام اپنی جامعیت کے لحاظ سے بے مثال تھا یہی وجہ تھی کہ وہ مسلمانوں کی زندگی کے تمام ظواہر پر حاوی تھا اور یہی نظام تھا جس سے اسلامی اتحاد کو قائم رکھنے میں بڑی مدد ملی حالاں کہ قرونِ وسطیٰ میں جو ممالک اسلام کے زیر نگیں آئے ان کی ثقافتوں میں بڑا زبردست اختلاف موجود تھا۔ چوں کہ اسلام کا فقہی نظام زندگی کے تمام پہلوؤں اور انفرادی، اجتماعی اور سیاسی طرزِ عمل پر حاوی تھا، اس نے ایک ایسے دور میں مسلمانوں کی معاشرتی وحدت کو قائم رکھا جب منگولوں کے وحشیانہ حملوں کے بعد جنہوں نے ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء میں بغداد کو تاراج کیا مسلمانوں کی سیاسی وحدت پارہ پارہ ہو چکی تھی۔

علماء کے نظام اور بالخصوص اسلامی فقہ کی نشو و نما نیز مسلم معاشرہ میں اس نے جو مرتبہ حاصل کر لیا تھا ان سب امور نے بالآخر اسلام میں ایک ایسا مناقشہ پیدا کیا جو اس مناقشہ سے بدرجہا زیادہ دور رس تھا جو یونانی فکر سے متاثرہ عقلیت نے مسلمانوں میں پیدا کیا تھا۔ یہ مناقشہ تصوف کے ظہور کے نتیجہ کے طور پر برپا ہوا جس کی ابتدا، عراق اور ایران کے ثقافتی مرکزوں میں دوسری/آٹھویں صدی اور تیسری/نویں صدی میں ہوئی اور جس کا مقصد یہ تھا کہ وجد و سرمستی کے ذریعہ اسلامی روحانیت کا جذبہ بیدار کیا جائے۔

ابتدائً تصوف کی تحریک کا نصب العین صرف اخلاقی بیداری اور تزکیۂ نفوس تک محدود تھا اور یہ سیاسی حکمرانوں کی دنیا داری اور فقہی موشگافیوں کے پھیلتے ہوئے اثر کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھی لیکن جلد ہی اس نے ذاتِ الٰہی کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کو اپنی کوششوں کا محور بنا لیا۔ چوتھی/دسویں صدی

تک صوفی تحریک صرف شہروں تک محدود رہی۔ اس زمانہ تک وہ روحانیت کی ایک انفرادی اور مخصوص شکل تھی جو اگرچہ حقیقی اور اصلی اسلام کے مزاج سے میل نہیں کھاتی تھی لیکن پھر بھی انسانی روح کے تصفیہ اور جلا کے ایک ایسے انداز کی مظہر تھی، جسے اسلام کے چوکھٹے میں جگہ دی جا سکتی تھی۔ لیکن پانچویں/ گیارہویں صدی کے دوران عالمِ اسلام کے اندر بعض ایسی تبدیلیاں ظہور میں آئیں جنہوں نے تصوف کی نوعیت میں بڑا زبردست انقلاب پیدا کر کے اسے ایک عوامی مذہب بنا دیا۔ اس طرح روحانیت کی اس نئی شکل اور علمار کے مزاج اور طریقِ کار کے درمیان جو فرق و اختلاف موجود تھا اس میں مزید شدت پیدا ہو گئی۔

جب بغداد کی اسلامی مرکزیت کمزور ہو گئی تو دسویں/ سولھویں صدی اور گیارہویں/ سترہویں صدی کے دوران شمالی افریقہ میں بدوی قبائلیت پھر سے زور پکڑنے لگی اور وسطی ایشیا کے وحشی ترکی قبائل مرکزِ اسلام پر چھا گئے۔ یہ ترکی قبائل علمار کی سرگرمیوں کے نتیجہ میں اسلام نہیں لائے تھے جیسا کہ عراق، ایران اور مصر میں ہوا تھا جہاں کی آبادی علمار کی کوششوں سے مسلمان ہوئی تھی بلکہ ترکی قبائل صوفیوں کی کوشش سے مسلمان ہوئے تھے۔ ان ترکی نومسلموں کی ذہنی سطح اور روحانی حالت کے مدنظر نیز ان کی قبائلی بدویت اور خشونت کا ازالہ کرنے کی غرض سے انہیں اسلام صوفیانہ رنگ و پیرہن میں پیش کیا گیا۔ راسخ العقیدہ علمار کے اسلام کو انہوں نے صرف ایک ظاہری علامت کے طور پر قبول کیا تھا لیکن ان کی زندگیوں پر اس روحانیت کا گہرا اثر تھا جس نے تصوف کو شہری آبادیوں کے ایک چیدہ گروہ کے طریقِ زندگی کی بجائے صوفیوں کے وسیع سلسلوں میں بدل دیا تھا۔ اس کے بعد سے ہندوستان، وسطی ایشیا، اناطولیہ اور افریقہ میں انہیں صوفی سلسلوں کے ذریعہ اسلام کی اشاعت عمل میں آئی۔ اور ان تمام علاقوں میں صوفیار نے اس روحانی ماحول کے ساتھ مصالحت کا راستہ اختیار کیا جو اس وقت وہاں موجود تھا۔ چنانچہ علمار کے سامنے یہ ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا کہ اس مناقشہ کو کس طرح رفع کیا جائے جو ان کے راسخ العقیدہ نظام اور تصوف کے مابین برپا ہو گیا تھا جس نے ایک عوامی مذہب کی صورت اختیار کر لی تھی۔

اسلام میں تصوف کے داخلہ کے ساتھ ہی ان علاقوں میں بھی اس کی اشاعت شروع ہو گئی، جہاں دوسری/ آٹھویں صدی تک اسلام کی شعاعیں نہیں پہنچ سکی تھیں۔ امام غزالی (متوفی ۵۰۵ھ/ ۱۱۱۱ء) نے اپنی زبردست تصانیف اور شخصیت کے ذریعہ راسخ العقیدہ علمار اور تصوف کے مابین جو مصالحت

پیدا کی تھی اس کی وجہ سے امتِ مسلمہ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ خود راسخ العقیدہ علما میں ایک نئی بیداری اور نئی قوت پیدا ہوگئی۔ باطنیت کی تحریک جو اہم ملحدانہ اور انتشار پسند فرقہ کی صورت میں رونما ہوئی تھی پسپا ہونے لگی۔ شیعیت کے ماننے والوں کی تعداد بھی کم ہوگئی۔ دوسری طرف کئی وسیع علاقوں میں جہاں اب تک کسی الہامی مذہب کی آواز نہیں پہنچی تھی یا جہاں کی آبادی نیم عیسائی تھی اب اسلام زور شور سے پھیلنے لگا۔ تصوّف اور راسخ العقیدہ علمار کے دینی افکار کے مناقشہ کے اتار چڑھاؤ کی تفصیلی بحث اس کتاب کے آئندہ ابواب میں شامل ہے۔

خلافتِ بغداد کی سیاسی مرکزیت کی کمزوری کے ساتھ ساتھ نیم خود مختار امرار اور سلاطین کا دَور شروع ہوگیا اور یہی وہ دَور تھا جب کہ تصوّف ایک ایسے مظہر کی حیثیت سے نشوونما پانے لگا جو ہر جگہ حاضر و موجود تھا۔ ترک سلاطین اگرچہ سطحی طور پر راسخ العقیدہ علمار کے ساتھ لطف و مروّت سے پیش آتے تھے لیکن ان کی وفاداری اور احترام کے اصل مرجع صوفی شیوخ تھے، عمومی طور پر اس دَور سے اسلام کی اشاعت صوفیار کے ذریعہ عمل میں آئی جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں لیکن مسلم سلطنتیں دینی عقائد اور قانونی ضوابط کے اسی ڈھانچہ میں رہ کر کام کرتی تھیں جسے راسخ العقیدہ علمار نے تیار کیا تھا۔ دسویں صدی/ سولھویں صدی تک دو بڑی طاقت ور اور متمرکز سلطنتیں یعنی سلطنت عثمانیہ ترکی میں اور سلطنت مغلیہ ہندوستان میں قیام پذیر ہو چکی تھیں۔ ان سلطنتوں کا نظم و نسق نہایت مہارت یافتہ، اور اس کی کارکردگی نہایت موثر تھی، جس کے باعث انہوں نے امتِ مسلمہ کو ایک نیا استحکام بخشا۔ اس ماحول میں ایک نئی اسلامی ثقافت کو فروغ ہوا۔ جسے ایرانی اسلامی ثقافت کہا جا سکتا ہے۔ خود ایران میں دولتِ صفویہ کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن اس کی وجہ سے ایران ثقافتی اور مذہبی اعتبار سے باقی اسلامی دنیا سے کٹ گیا۔ کیوں کہ صفوی حکمرانوں نے اولاً دوسری مسلمان حکومتوں کے ساتھ مخاصمانہ روّیہ اختیار کیا، اور دوم اُنہوں نے شیعہ مذہب کو ایران کا سرکاری مذہب بنا دیا۔ اگرچہ اس نئی ثقافت کا بیرونی ڈھانچہ راسخ العقیدہ علمار کی فقہ پر مبنی تھا لیکن اس کے محتویات اسلامی ایرانی فنونِ لطیفہ اور شاعری سے مرکب تھے اور ایک حریت پسندانہ رجحان کی نمائندگی کرتے تھے جس میں تصوّف کے افکار کا گہرا اثر تھا اور جو مسلمانوں کی کلاسکی ثقافت کا شعوری طور پر مخالف تھا۔ یہ نئی ثقافت سلطنتِ مغلیہ اور سلاطین ترکی کے درباروں میں اس وقت تک فروغ پاتی رہی جب تک کہ اس کا تصادم مغرب کے فکری

رجحانات اور سیاسی قوت سے نہیں ہوا۔

بارہویں/اٹھارہویں صدی کے دوران سلطنتِ مغلیہ اور سلطنت عثمانیہ دونوں پر یکساں زوال طاری رہا۔ ہندوستان میں مغل سلطنت کی جگہ برطانوی قوت کا عمل دخل ہوگیا لیکن سلاطین عثمانی نے مغرب کے حربی طریقوں کو مستعار لے کر اور دیگر اصلاحات کے ذریعہ اپنی رو بہ زوال طاقت کو مکمل انحلال سے بچا لیا یہاں تک کہ پہلی جنگِ عظیم میں انہیں شکست اُٹھانی پڑی۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے ابتدائی دَور میں عالم اسلام پر انتشار طاری رہا۔ لیکن ایک معاشرتی اور مذہبی قوت کی حیثیت سے اسلام نہ صرف زندہ رہا بلکہ اس میں بیداری اور نہضت کی ایک نئی لہر دوڑ گئی، جو زمانہ ماضی کی طرح اس کی سیاسی بحالی میں بھی معاون ثابت ہوئی، لیکن اس کی انفرادیت اور تہذیب وثقافت پر عہد جدید کی قوتوں کا اثر پڑ رہا ہے اور مسلم معاشرہ ابھی تک ایک عبوری دَور سے گزر رہا ہے۔

ساتویں/تیرھویں صدی اور آٹھویں/چودہویں صدی میں زیادہ تر عرب سوداگروں کے باعث اسلام مجمع الجزائر ملایا میں پھیلنے لگا۔ پھر اس کے بعد جاوا اور سماٹرا میں پُرامن ذرائع سے اسلام کی اشاعت عمل میں آنے لگی یہاں تک کہ بالآخر جزیرہ نمائے ملایا پر بھی اسلام کی شعاعیں ضو افگن ہوگئیں۔ لیکن اس علاقہ میں اسلام کا اثر ابھی پورے طور پر راسخ بھی نہیں ہوا تھا اور مسلمان حکومتیں اپنے پیروں پر کھڑی بھی نہ ہوئی تھیں کہ وہاں مغربی یورپ کی اقوام کا فوجی اور انتظامی تسلط ہوگیا۔ اس لئے انڈونیشیا میں اسلام سماج اور ثقافت کی صرف بالائی سطح کو متاثر کرنے میں کامیاب رہا جب کہ ان کی نچلی سطح ابھی تک بعض اہم پہلوؤں سے مشرکانہ رسوم وعقائد پر قائم ہے۔ لیکن موجودہ صدی میں پہلے مشرق وسطیٰ اور پھر جزیرہ نمائے عرب سے بعض اسلامی اثرات انڈونیشیا میں داخل ہوئے اور ان کے نتیجہ میں راسخ العقیدہ علماء کے مختلف گروہ پیدا ہوگئے جو متحرک بھی ہیں اور فعّال بھی۔ اس طرح انڈونیشی سماج کی اندرونی گہرائیوں تک اسلام کا اثر سرایت کرتا جا رہا ہے۔

چین میں اسلام کی اشاعت کب اور کس طرح عمل میں آئی، اس کے بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی ہے لیکن اکثر علماء کا خیال یہ ہے کہ منگول حکمرانوں کے عہد میں اسلام کو چین میں استحکام نصیب ہوا اگرچہ چینیوں کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام اپنی تاریخ کے ابتدائی دَور ہی میں چین کی سرحدات میں داخل ہوچکا تھا۔ اس سوال کا تصفیہ کرنے کے لئے چینی تاریخ کے مصادر کا گہرا مطالعہ کرنا ہوگا نیز چین کے مسلم معاشرہ کے ارتقاء کا

تجزیہ بھی کرنا پڑے گا۔ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ وسطی ایشیا اور اناطولیہ میں اسلام کی اشاعت صوفی تحریک کے ذریعہ عمل میں آئی۔ افریقہ میں صحرائے اعظم کے جنوب میں اسلام کا داخلہ کیوں کر عمل میں آیا، اس کے بارے میں ابھی تک کوئی باقاعدہ اور جامع تحقیقات نہیں کی گئی۔ جہاں تک مشرقی افریقہ کا تعلق ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تک غلاموں کی تجارت کا سلسلہ جاری رہا مشرقی افریقہ میں اسلام کوئی قابلِ ذکر ترقی نہ کر سکا لیکن جوں ہی غلامی کو ممنوع قرار دیا گیا اندرونِ ملک مسلمانوں کی تبلیغی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔

افریقہ میں اسلام کی اشاعت کی ایک بڑی خصوصیت یہ رہی ہے کہ صوفی تبلیغی جدوجہد اور راسخ العقیدہ علماء کے تصورِ جہاد نے مل کر ایک ساتھ کام کیا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی افریقی معاشرہ قبائلی بنیادوں پر استوار تھا۔ زمانۂ حال میں عیسائی تبلیغی سرگرمیوں کے باوجود اسلام سیاہ فام افریقیوں میں تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ افریقی عوام میں مغرب کی سیاسی بالادستی کے خلاف ایک عام جذبۂ نفرت پایا جاتا ہے۔ جنوبی افریقہ میں بھی مسلمان خاصی تعداد میں موجود ہیں مگر یہ وہ لوگ ہیں جو ذیلی برّاعظم پاک و ہند سے ترک وطن کر کے یہاں آ بسے ہیں لیکن یوں بھی یہاں کی افریقی آبادی میں اسلام کی اشاعت عمل میں آ رہی ہے جس کی وجہ زیادہ تر جنوبی افریقہ کی سفید فام حکومت کی نسلی امتیاز کی پالیسی ہے۔ مشرقی یورپ کے ممالک میں بھی مسلمانوں کی معتدبہ آبادیاں پائی جاتی ہیں۔ مغربی یورپ اور امریکہ میں بہت سے مسلمان باہر سے آ کر بس گئے اور بعض سفید فام یورپی اور امریکی باشندے بھی تبدیلی مذہب کے نتیجہ میں مسلمان ہو چکے ہیں اور اب ان کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ گذشتہ چند سال سے ممالکِ متحدہ امریکہ میں مسلمان حبشی النسل افراد کی آبادی بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ لوگ اپنا قدیم مذہب ترک کر کے مسلمان ہو رہے ہیں اور "سیاہ فام مسلمانوں" کے نام سے معروف ہیں۔ اگرچہ سیاہ فام امریکنوں میں اسلام کی اشاعت کا ایک بڑا سبب ان لوگوں کے سماجی اور سیاسی حالات ہیں جن کے خلاف ان کا یہ ردّعمل بالکل قدرتی ہے لیکن خود افریقہ کے سیاہ فام باشندوں میں اسلام کی اشاعت کا بھی اس میں کچھ نہ کچھ دخل ضرور رہا ہے۔

مغربی تعلیم اور مغربی افکار کا اسلامی ممالک کی روایتی ثقافت پر کیا ردّعمل ہوا، اور اس ردّعمل کے کیا نتائج ہوئے، اس پر ہم اس کتاب کے آخری دو ابواب میں بحث کریں گے۔ یہاں اس امر کی

نشان دہی کرنی ضروری ہے کہ مغرب کے سیاسی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے بعد اسلامی ممالک میں ریاستی سطح پر مشترکہ معاشی، ثقافتی اور سیاسی اقدامات کی کامیابی کے لئے علاقہ واری تنظیمات قائم کرنے کا رجحان پیدا ہو گیا۔ مشرق وسطی کے عرب ممالک اگرچہ اب تک کوئی باہمی اتحاد قائم نہیں کر سکے لیکن ان میں اغراض و مقاصد کے اشتراک کا احساس پیدا ہو گیا ہے جو ممکن ہے نتیجہ خیز ثابت ہو۔ اگرچہ اسرائیلی مملکت کے وجود سے اس رجحان کو تقویت مل رہی ہے لیکن درحقیقت یہ رجحان عرب ممالک کے داخلی حالات اور تقاضوں سے ابھرا ہے۔ استنبول کا حالیہ معاہدہ (جون ۱۹۶۴ء) جو پاکستان، ایران اور ترکی کے مابین طے پایا ہے اور جو عرف عام میں "علاقہ واری تعاون برائے ترقی" کے نام سے مشہور ہے، اس مقصد کی جانب ایک اہم قدم ہے۔ آئندہ چند برسوں میں اس قسم کی اور علاقہ واری تنظیمیں قائم ہو سکتی ہیں۔ روئے زمین کے تمام مسلمانوں میں ایک متحدہ عالم اسلام کے قیام کی زبردست خواہش پائی جاتی ہے، یہ صرف مستقبل بتا سکے گا کہ اس قسم کا اتحاد ممکن ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس کی صورت کیا ہو گی۔ لیکن اگر یہ اتحاد وقوع پذیر ہو گیا تو ظاہر ہے کہ ساری دنیا کے لئے اس کی بڑی اہمیت ہو گی۔

نوٹ | **دنیا کی کل مسلم آبادی**

خود مختار مسلم ممالک	۳۸۰۸۴۶۰۰۰
غیر مسلم حکومتوں کے تحت مسلمان اکثریت	۱۸۲۲۱۴۰۰۰
مسلمان اقلیتیں	۳۰۹۲۶۰۰۰
کل آبادی	۵۹۳۹۸۶۰۰۰

اس مرقعہ میں سب سے زیادہ دلچسپ عامل چینی مسلمانوں کی تعداد ہے، اپنی تصنیف علاقات العرب والصین (قاہرہ سنہ ۱۳۷۰ھ/سنہ ۱۹۵۰ء) میں بدرالدین الصینی نے دعوی کیا ہے کہ چینی مسلمان چین کی کل آبادی کا دسواں حصہ ہیں۔ بانڈنگ کانفرنس میں چین کے وزیر اعظم مسٹر چو این لائی نے بیان کیا کہ چینی مسلمانوں کی تعداد چین کی کل آبادی کی بارہ فی صد ہے اور اس لئے ان کی آبادی ہندوستانی مسلمانوں کی آبادی سے زیادہ ہے لیکن چین میں سرکاری طور پر جو مردم شماری ہوئی ہے اس کے پیش کردہ اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی کل آبادی ایک کروڑ ہے لیکن یہاں یہ بات بتا دینی ضروری ہے کہ چونکہ کمیونسٹ چین میں آبادی کی تقسیم کے سلسلہ میں مذہب کا لحاظ نہیں کیا جاتا ہے اور آبادی کی تقسیم قبائلی بنیادوں پر کی جاتی ہے اس لئے صرف انہیں قبیلوں کو مسلمان قرار دیا گیا ہے جن کی آبادی صد فی صد مسلمان ہے۔ اس میں ہوئی قبائل خاص طور پر شامل ہیں کیوں کہ ان کی ساری آبادی مسلمان ہے۔